جی چاہتا ہے نقشِ قدم چومتے چلیں

شمس العلماء
علامہ شبلی نعمانیؒ

خان یاسر

امی، ابّی اور دادا کے نام

جن سے میں نے سیکھا کہ
عظیم شخصیات
آسمان سے نہیں اترتیں
بلکہ
زمین پر پیدا ہوتی ہیں،
زمین سے وابستہ ہوتی ہیں؛
اور یہ کہ
ہر بچہ
اگر 'چاہے'
تو 'بڑا' آدمی بن سکتا ہے...

رہتا ہوں چپ تو ہوتی ہے دل میں گھٹن عزیز
اظہارِ غم کروں تو کریں سنگسار لوگ

”اسلام نے جو انتظام قائم کیا، اس کی رو سے ہر مسلمان فوجی خدمت کے لیے مجبور کیا جا سکتا تھا... لیکن غیر مذہب والے جو اسلامی حکومت کے ماتحت تھے اور جن کی حفاظت مسلمانوں کو کرنی پڑتی تھی، ان کو فوجی خدمت کے لیے مجبور کرنے کا اسلام کو کوئی حق نہ تھا... اس لیے ضرور تھا کہ وہ اپنی محافظت کا کوئی معاوضہ دیں، اسی معاوضے کا نام جزیہ تھا جو فارسی سے معرب کیا گیا تھا لیکن کسی موقع پر غیر قوموں نے فوج میں شرک ہونا یا شرکت کے لیے آمادہ ہونا گوارا کیا تو وہ جزیہ سے بری کر دیے گئے...

جزیہ کی تعداد زیادہ سے زیادہ بیس روپے سالانہ تھی۔ کسی کے پاس لاکھوں روپے ہوں تو اس سے زیادہ نہیں دینا پڑتا تھا۔ عام شرح چھ روپے اور تین روپے سالانہ تھی۔ بیس برس سے کم اور پچاس برس سے زیادہ عمر والے اور عورتیں، مفلوج، معطل العضو، نابینا، مجنون، مفلس یعنی جس کے پاس دو سو درہم سے کم ہو، یہ لوگ عموماً جزیہ سے معاف تھے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ ایسا ہلکا ٹیکس جس کی تعداد اس قدر قلیل تھی، جس کے ادا کرنے سے فوجی پر خطر خدمت سے نجات مل جاتی تھی، جس کی بنیاد نوشیرواں عادل نے ڈالی تھی، کیا ایسی ناگوار چیز ہو سکتی ہے، جیسی کہ اہل یورپ نے خیال کی ہے۔ کیا دنیا میں ایک شخص نے بھی اس سے بچنے کے لیے اپنا مذہب چھوڑا ہوگا؟ کیا کسی نے اپنے مذہب کو ایسے ہلکے ٹیکس سے بھی کم قیمت سمجھا ہوگا؟ اگر کسی نے ایسا سمجھا تو ہم کو اس کے مذہب کے ضائع ہونے کا رنج بھی نہ کرنا چاہیے۔“[۵]

(شبلی نعمانی)

شبلی نعمانی

پیدائش اور تعلیمی سفر: شبلی نعمانی کی پیدائش اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بندول میں مئی 1857 کو ہوئی۔ ان کے والد بزرگوار نے گو اپنے دیگر بیٹوں کو انگریزی تعلیم دلائی لیکن شبلی کو عربی تعلیم دلانے کا فیصلہ کیا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں میں ہوئی پھر ضلع کے ایک عربی مدرسے میں داخل ہوئے۔ بچپن سے انھیں نئی نئی کتابوں کی ورق گردانی کا شوق تھا، کتب بینی کے علاوہ شروع ہی سے ان کا ادبی ذوق بھی نمایاں تھا۔ وہ کتاب کو صرف 'پڑھنے' کے قائل نہیں تھے بلکہ پڑھتے پڑھتے مصنف کی غلطیوں اور کاتب کی فروگذاشتوں سے تعرض کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ناقدانہ شعور شروع ہی سے بالیدہ تھا اور ان کی فطری ذہانت کی دلیل بھی۔ زمانۂ طالب علمی ہی سے انھیں مناظروں کا بڑا شوق رہا۔ چنانچہ حنفیت بمقابلہ وہابیت، کے مناظروں میں 'پامردی' دکھانے پر ان کے محبوب استاد مولانا فاروق چریا کوٹی نے امام ابوحنیفہ کی نسبت سے ان کے نام کے ساتھ نعمانی کا اضافہ کردیا۔ ضلع کے عربی مدرسے کے بعد آپ نے بالترتیب غازی پور، رام پور، دیوبند، لاہور اور سہارنپور جا کر ادب، منطق، معقولات، اصول فقہ، بلاغت، حدیث وغیرہ کی تعلیم کامل اساتذہ سے براہ راست حاصل کی۔ آپ کو علم کا شوق جنون کی حد تک تھا، چنانچہ لاہور کے سفر کے دوران جس باکمال استاذ سے آپ ادبیات کا درس لینا چاہتے تھے وہ کالج میں پروفیسر بھی تھے، اور اپنی دیگر مصروفیات کے باعث وقت فارغ نہیں کر پا رہے تھے۔ چنانچہ یہ طے پایا کہ استاذ صاحب کے گھر سے کالج جانے تک راستے میں شبلی ان سے ادبیات کا درس لیں گے۔

19 برس کی عمر میں ہی شبلی نے حج کیا، اس سفر میں مدینے کے کتب خانوں سے دل کھول کر استفادہ کیا۔ اس دور میں شبلی مستقبل میں اپنے رول کے بارے میں تھوڑے متشکک اور پس و پیش میں نظر آتے ہیں۔ کبھی آپ نے والد کے اصرار پر وکالت کا امتحان دیا، پہلے ناکام ہوئے پھر امتیازی نمبروں سے

کامیابی حاصل کی۔ پھر درس و تدریس میں مشغول ہوئے، کبھی شعروشاعری میں طبع آزمائی کی، کلکٹری میں ملازم ہوئے، بستی میں وکالت بھی کی۔ بالآخر سرسید کے ایماء پر ایم او کالج (علی گڑھ) بلا لیے گئے، جہاں ترقی کرتے کرتے وہ عربی کے پروفیسر ہوگئے۔

علی گڑھ سے ندوہ تک: علی گڑھ کے زمانۂ قیام میں انھوں نے سرسید کے کتب خانے سے بھرپور استفادہ کیا۔ آپ کالج کے طلبہ کو انتہائی دلچسپ انداز میں قرآن کا درس بھی دیتے، ان دروس قرآن نے نہ جانے کتنے طلبہ میں قرآنی ذوق پیدا کردیا۔ یہیں آپ کو یورپی تاریخ دانوں کی کتابوں سے واقفیت ہوئی۔ انھوں نے فرنچ سیکھی اور یورپ کی علمی تحقیقات کے جدید اصولوں سے روشناس ہوئے۔ سرسید کے برعکس انھوں نے مغرب سے فائدہ تو خوب اٹھایا مگر مسحور و مرعوب نہ ہوئے۔ شبلی مذہبی معاملات میں سرسید کی انتہاپسندی، ٹھیٹھ عقلیت پرستی اور برطانوی حکومت کی جی حضوری کے سخت مخالف تھے۔ الفاروق لکھنے کے لیے 1893 میں انھوں نے قسطنطنیہ، مصر، شام، بیروت اور بیت المقدس کے کتب خانے چھان مارے۔ ان کی اعلیٰ علمی خدمات کے اعتراف میں سلطان عبدالحمید نے انھیں **تمغۂ مجیدی** عطا کیا۔ 1894 میں حکومت ہند کی طرف سے انھیں **شمس العلماء** کا خطاب بھی ملا۔

اس دوران سرسید سے شبلی کے اختلافات بڑھتے رہے۔ انگریزوں کے معاملے میں ان کی بیبا کی سرسید کوراس نہ آتی تھی۔ سرسید کا 1897 میں انتقال ہوگیا جس کے تین مہینے بعد ہی طلبہ کے لاکھ اصرار کے باوجود شبلی نے کالج کو الوداع کہہ دیا۔ 1900 میں ان کے والد کی وفات ہوئی جو ورثے میں تیس ہزار کا قرض چھوڑ گئے۔ اس قرض کی ادائیگی کے لیے شبلی نے نظام حیدرآباد کی ریاست میں سررشتہ علوم وفنون میں بحیثیت ناظم ملازمت اختیار کی۔ 1905 میں اس قرض کو ادا کردینے کے بعد وہ ملازمت سے مستعفی ہوگئے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم بنالیے گئے۔ انھوں نے ندوہ میں جدید نصاب کا اجرا کیا؛ نصاب میں انگریزی تعلیم لازمی قرار دی تاکہ طلبہ میں انگریزی کے معاملے میں کم ازکم میٹرک کی سطح کی لیاقت پیدا ہوجائے؛ انھوں نے ہندی اور سنسکرت کی تعلیم کا بھی ایک شعبہ قائم کیا؛ کوشش کی کہ قابل ترین اساتذہ کو ندوہ لایا جائے؛ نئی عمارت اور دارالاقامہ کے کام کو آگے بڑھایا؛ متعدد سالانہ جلسوں کے ذریعے ندوہ کے پیغام کو پوری آب وتاب کے ساتھ ملتِ اسلامیہ ہند کے سامنے پیش کیا۔ ندوہ میں آپ باقاعدگی سے قرآن کا درس بھی دیتے رہے۔ ہونہار طلبہ کی تربیت پر آپ کی خصوصی توجہ

تھی؛ انھوں نے ندوہ کے لیے تین ہزار کتابوں سے معمور اپنا ذاتی کتب خانہ ہبہ کر دیا۔ ندوہ کی مالی حالت درست کرنے کے لیے موثر اقدامات کیے۔ **الندوہ** کے ایڈیٹر بھی ہو گئے۔ 1912 تک کے اپنے ادارتی کریئر میں انھوں نے اعلیٰ پائے کے مذہبی، ادبی، تعلیمی، تنقیدی، تاریخی اور سیاسی مضامین کے انبار لگا دیے۔ انھوں نے تاریخ کی نصابی کتب میں مسلمانوں کی غلط شبیہہ کے ازالے اور جاہل مسلمانوں میں ارتداد کی رو کے مقابلے کے لیے **تصحیحِ اغلاطِ تاریخ** اور **مجلس اشاعت و حفاظتِ اسلام** نامی، ندوہ کے دو مستقبل شعبے بھی بنائے۔

1907 میں علامہ شبلی ایک حادثے میں اپنا پاؤں زخمی کر بیٹھے جسے کاٹ دینا پڑا۔ باوجود صحت کی خرابی اور اس نئی مصیبت کے انھوں نے **شعر العجم** کی پانچ جلدوں کی سرعت سے تکمیل کی۔ اس دوران آپ ریاست حیدر آباد کی طرف سے عربی و فارسی تعلیم کے نصاب کو از سر نو مرتب کرنے کے لیے بنائی گئی کمیٹی کے بھی ممبر رہے، مشرقی بنگال اور آسام میں مدارس کی اصلاح کے لیے بھی ایک کمیٹی کے ممبر رہے۔ ہر جگہ ان کے مفید مشوروں نے تعلیمی کام کو نئے خطوط پر آگے بڑھانے کی راہ ہموار کی۔ چند اشخاص کی معاصرانہ چشمک سے بددل ہو کر بالآخر جولائی 1913 کو انھوں نے دار العلوم کی معتمدی سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد باوجود طلبہ کے ہزارہا احتجاجات اور مولانا محمد علی جوہر، مولانا آزاد اور حکیم اجمل خان کی مداخلت کے، اس منصب کو دوبارہ قبول نہ کیا۔

مؤرخ، سوانح نگار، شاعر، فلسفی، مفکر... یہ سب اور نہ جانے کیا کیا۔ شبلی نعمانی غضب کے انشا پرداز تھے۔ ان کا اسلوب تحریر اتنا دلنشیں، بے ساختہ اور تصنع سے پاک ہے کہ بات سیدھے قاری کے دل پر اثر کرتی ہے۔ انھوں نے تاریخ جیسے خشک موضوع کو بھی ادب کی چاشنی سے آراستہ کیا۔ ان کا ادب، ان کی تاریخ نگاری اور ان کا فلسفہ سب کچھ با مقصد تھا۔ ان کی سوانحی تصانیف میں المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم اور سیرۃ النبی جیسی معرکۃ الآرا کتب شامل ہیں جن میں ہر ایک اپنی مثال آپ ہے۔ سوانح لکھتے وقت شبلی اپنے ہیرو کی بیجا تعریف پسند نہیں کرتے وہ حقائق و واقعات کا معروضی اور غیر جانبدارانہ تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ لیکن 'غیر جانبدار' کہلانے کے لیے وہ شخصیات پر بیجا تنقید کے بھی سخت مخالف ہیں۔ سوانح نگاری سے ان کا مقصد صرف یہی نہیں تھا کہ کسی شخصیت کے احوال مستند طور پر ایک جگہ جمع کر دیے جائیں بلکہ وہ ان سے عوام کی اصلاحِ اخلاق کا کام لینا چاہتے تھے، جس کا ایک بہترین طریقہ یہ ہے کہ نفوس قدسیہ کی زندگیوں کو عوام

کے سامنے بطور قابل تقلید نمونہ پیش کر دیا جائے، جن کے نقش قدم کو چومتے ہوئے، زندگی کی راہوں پر آگے بڑھا جائے اور جو ٹھوکریں انھوں نے کھائی ہوں، ان سے بچا جائے۔

شبلی نعمانی کا دور ایک ایسا پر آشوب دور تھا جب پوری مغربی اسکالرشپ اسلام، اسلامی تاریخ اور پیغمبر اسلامؐ کے پیچھے 'نہا دھو کر' پڑی ہوئی تھی۔ مسلمانوں کو احساس کمتری کے دلدل میں دھنسا دینے کے لیے مستشرقین نے تاریخ میں ایسی ایسی غلاظتوں کی آمیزش کی کہ **الامان و الحفیظ**۔ شبلی نے تن تنہا بغیر کسی مداہنت کے ان غلاظتوں کو صاف کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ **کتب خانۂ اسکندریہ** (جس میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ جس کتب خانے کو جلانے کا سہرا عمرؓ کے سر باندھا جاتا ہے وہ مسلمانوں کے مصر فتح کرنے سے پہلے ہی عیسائیوں کے ذریعے جلایا جا چکا تھا)، **الجزیہ**، **مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم**، **اسلامی کتب خانے**، **اسلامی مدارس**، **میکنکس اور مسلمان**، **حقوق الذمیین**، **اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر**، **اسلامی حکومتیں اور شفاخانے** وغیرہ ان کے کچھ ایسے مقالے اور رسالے ہیں جن میں تحقیق کے اعلیٰ ترین نہج پر انھوں نے معاندینِ اسلام کے غلط پروپیگنڈوں کا ابطال کیا ہے۔ **الکلام** اور **علم الکلام** لکھ کر وہ بحیثیت فلسفی بھی لافانی ہو گئے۔ **کلیات**، **شعر العجم** اور **موازنۂ انیس و دبیر** ان کے ادبی ذوق کے ترجمان ہیں۔

وقتِ آخر: شبلی نے سیاست میں بھی دلچسپی دکھائی، گو وہ اول و آخر ایک محقق تھے لیکن وہ انگریزی استبداد کے مخالف اور جمہوریت کے حامی تھے۔ وہ مسلم لیگ کے خلاف تھے اور کانگریس کو پسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے۔ **حالاتِ حاضرہ پر نہ صرف مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ** جیسے مضامین بلکہ ان کے برجستہ اشعار اور نظموں نے بھی عوام میں اسلامی حمیت اور آزادی کی روح پھونک دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ تعطیل جمعہ، **وقف علی الاولاد**، اور اسلامی اوقاف کے مسائل سے لے کر مسجد کانپور کے ہنگامے اور گورنمنٹ کے منظور شدہ نصاب میں تاریخی غلطیوں کی نشاندہی تک ہر مسئلہ پر انھوں نے امت مسلمہ کی رہنمائی کے فرائض انجام دیے۔ زندگی کے آخری دور میں انھوں نے **مدرسۃ الاصلاح** سے بھی دلچسپی لی، **دار المصنفین** کے بیج بوئے جو ان کے بعد ایک تناور درخت بن کر ان کے لیے صدقۂ جاریہ بنا۔ خدا کے محبوبؐ کی سیرت لکھنے میں منہمک ہی تھے کہ پیغام اجل آ پہنچا۔ 18 نومبر 1914 کو انتقال فرمایا۔ اللہ ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ آمین!